خاکہ

اصطلاحی معنی میں لفظ ''خاکہ'' انگریزی لفظ اسکیچ (Sketch) کا ترجمہ ہے۔شخصی خاکے کے لیے انگریزی میں Pen Portrait یا Personal Sketch کی اصطلاحیں بھی استعمال کی گئی ہیں۔آج کل ''خاکہ'' ہی کی اصطلاح رائج ہے۔خاکے سے مراد ایک ایسی نثری تحریر ہوتی ہے جس میں کسی شخصیت کی منفرد اور نمایاں خصوصیات کو اس انداز سے بیان کیا جاتا ہے کہ اس کی مکمّل تصویر آنکھوں کے سامنے آجائے۔اس میں جس شخص کی تصویر کشی کی جاتی ہے اس کے خیالات و افکار، سیرت وکردار، عادات واطوار سب کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔خاکے کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ متعلقہ شخصیت کی ظاہری اور باطنی خصوصیات میں سے ایسے نمایاں اوصاف کا بیان کیا جائے جو اس کی انفرادیت اور پہچان کا ذریعہ ہوں۔اس کے لیے خاکہ لکھنے والے کا اُس انسان کی شخصیت سے نہ صرف متاثّر ہونا ضروری ہے بلکہ اُس سے واقفیت اور قربت بھی ضروری ہے۔خاکہ نگاری سوانح نگاری سے مختلف ہے۔اس میں سوانح حیات کی طرح واقعات ترتیب وار نہیں لکھے جاتے اور نہ ہی تمام حالات و واقعات کا بیان کرنا ضروری ہے بلکہ خاکہ نگاری میں حالات و واقعات کا بیان ضمنی طور پر کیا جاتا ہے جو شخصیت کے کسی پہلو کو اُجاگر کرتے ہیں۔خاکہ نگار کسی شخصیت سے متاثر ہوکر اس کا خاکہ ضرور لکھتا ہے،لیکن اس کی تحریر سے مرعوبیت کا اظہار نہیں ہونا چاہیے۔اُس کا بیان ایسا ہونا چاہیے کہ وہ غیر جانبدار نظر آئے۔اس لیے یہ ضروری ہے کہ خاکے میں شخصیت کی خوبیوں اور خامیوں دونوں کو بیان کیا جائے، ورنہ شخصیت کی مکمّل تصویر سامنے نہ آسکے گی جو خاکہ نگاری کا اصل مقصد ہے۔جس

© NCERT not to be republished

طرح خوبیوں کا بیان مرعوبیت سے پاک ہونا چاہیے، اسی طرح خامیوں کے بیان میں ذاتی دشمنی وعناد کا پہلو نہیں آنا چاہیے۔ خامیوں کے بیان میں بھی اپنائیت کا احساس نمایاں ہونا چاہیے۔

© NCERT not to be republished

شاہد احمد دہلوی

(1967 — 1906)

شاہد احمد دہلی میں پیدا ہوئے۔ وہ اردو کے ممتاز نثر نگار مولوی نذیر احمد کے پوتے تھے۔ انھوں نے دہلی سے ''ساقی'' کے نام سے ایک ماہنامہ جاری کیا جو بہت مشہور ہوا۔ رسالہ ''ساقی'' کی بدولت ان گنت شاعر اور ادیب منظر عام پر آئے۔

ستمبر 1947ء میں شاہد احمد پاکستان چلے گئے۔ وہاں سے رسالہ ''ساقی'' جاری کیا۔ پاکستان میں انھوں نے ناول، افسانے، ڈرامے اور نفسیاتی کتابوں کے انگریزی سے اردو میں ترجمے کیے۔

شاہد احمد دہلوی کو اپنے دادا کی طرح دلّی کی زبان پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ وہ کم سے کم اور موزوں ترین الفاظ میں اپنی بات کہہ جاتے ہیں۔

شاہد احمد دہلوی نے اردو کے کئی مشہور و مقبول ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ ساتھ اپنے بزرگوں، دوستوں اور عزیزوں پر انتہائی دلچسپ اور معلوماتی خاکے لکھے ہیں۔ اُن کا لکھا ہوا ایک خاکہ دلّی کے آخری داستان گو میر باقر علی کا ہے۔ اس خاکے میں شاہد احمد دہلوی نے میر باقر علی کی شخصیت، سیرت اور ان کے داستان سنانے کے انداز کو اس طرح بیان کیا ہے کہ لگتا ہے ہم خود میر باقر علی کے روبرو موجود ہیں۔

© NCERT not to be republished

میر باقر علی داستان گو

داستان گوئی کا فن اب ہمارے ہاں بالکل ختم ہو چکا ہے۔ دلّی کے آخری داستان گو میر باقر علی تھے جن کے انتقال کو اب بیس برس سے اوپر ہوئے۔ دُبلے پتلے سے آدمی تھے۔ سفید چھوٹی سی داڑھی، سر پر دو پلّی، پاؤں میں دیسی جوتی، انگرکھا اور چُست پاجامہ پہنتے تھے۔ عمر ساٹھ اور ستّر کے درمیان، کھلتا ہوا رنگ، سُوا سی ناک، میانہ قد، باتیں کرتے تو منھ سے پھول جھڑتے۔ داستان سُنانے دوُر دوُر جاتے تھے۔ رجواڑوں اور نوابوں میں بُلائے جاتے۔ ایک زمانے میں ریاست پٹیالہ میں داستان سُنانے کے لیے ملازم بھی رہے۔ رئیس مر گیا تو دلّی واپس آگئے۔ اِملی کی پہاڑی پر گھر تھا۔ آخری وقت میں افلاس نے گھیر لیا تھا۔ سنیما ایسا چلا کہ میر صاحب کی پرُسش ختم ہوگئی۔ دلّی کے ہندو رئیس چھُنّا مل کے ہاں کسی وقت میں چالیس پچاس روپے ماہوار پر ملازم تھے۔ چھُنّا مل والوں کا بیان ہے کہ ہم میر صاحب سے بچپن سے داستان سُن رہے ہیں۔ بیس پچیس سال ہوگئے، ایک داستان ہی ختم ہونے میں نہیں آتی۔ میرے بچپن میں میر صاحب فراش خانہ میں داستان سنایا کرتے تھے۔ ہفتے میں ان کا ایک دن مقرر تھا۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ داستان کہتے۔ برسوں یہ سلسلہ جاری رہا۔ داستان کا ایک حصّہ سنانے پائے تھے کہ یہ سلسلہ ختم ہوگیا۔ میر صاحب ہمیشہ 'داستانِ امیر حمزہ' ہی سنایا کرتے تھے۔ ایک نے ان سے پوچھا کہ میر صاحب! یہ داستان کبھی آپ نے ختم بھی کی ہے؟ بولے ''عمر بھر میں ایک دفعہ۔''

میر صاحب کے آبا و اجداد شاہی داستان گو تھے۔ غالباً ان ہی میں سے کسی کے متعلق یہ روایت مشہور تھی کہ بادشاہ کو روزانہ داستان سنایا کرتے تھے۔ ایک موقع ایسا آیا

© NCERT not to be republished

کہ عاشق ومعشوق کے درمیان صرف ایک پردہ حائل تھا۔ پردہ اُٹھ جائے تو وصال ہوجائے۔ مگر داستان گو نے احساسات، خیالات اور کیفیات کے بیان میں بارہ سال گزار دیے اور پردہ نہ اُٹھا۔ آخر بادشاہ کا اشتیاق بے قابو ہوگیا اور اس نے تنگ آ کر کہا۔ ''آج پردہ اُٹھ جانا چاہیے'' تب کہیں وہ پردہ اُٹھا۔ میر صاحب کا بھی اسی سے کچھ مِلتا جُلتا حال تھا۔ بیگم کے بناؤ سنگھار میں ایک نشست ختم کر دیتے تھے۔ آراستہ ہونے کی تفصیل، زیورات کی قِسمیں، لباس کی قِسمیں، زیورات کی تفصیل شروع ہوتی تو میر صاحب سیکڑوں نام گِنا جاتے۔ پھر یہ بھی بتاتے کہ شاہی بیگمات کے زیور کیا ہوتے تھے، درمیانہ طبقے کی خواتین کون کون سے زیور پہنتی تھیں۔ بھٹیارنیاں، سقنیاں اور مہترانیاں کیا کیا پہنتی تھیں۔

میر صاحب بزم اور رزم کو اس انداز سے بیان کرتے کہ آنکھوں کے سامنے پورا نقشہ کھینچ جاتا۔ داستان کہتے جاتے اور موقع بہ موقع ایکٹنگ کرتے جاتے۔ آواز کے زیر و بم اور لب و لہجے سے بھی اثر بڑھاتے۔ امیر حمزہ اور عیّاروں کا جب بیان کرتے تو ہنساتے ہنساتے لٹا دیتے۔ ہتھیاروں کے نام گنانے شروع کرتے تو سو ڈیڑھ سو نام ایک سانس میں لے جاتے۔ پھر کمال یہ کہ نام صرف طوطے کی طرح رٹے ہوئے نہیں تھے بلکہ آپ جب چاہیں، ٹوک کر کسی ہتھیار کی شکل اور اس کا استعمال دریافت کر سکتے تھے۔ میر صاحب پوچھنے سے چِڑتے نہ تھے بلکہ خوش ہوتے اور تفصیل سے بتاتے۔ مثلاً منجنیق کو بیان کرنے ہی میں پندرہ منٹ صَرف کر دیتے۔ عورت کا حُسن بیان کرنے پر آئیں تو زمین آسمان کے قلابے ملا دیں اور کچھ نہیں تو چال کی ہی سیکڑوں قِسمیں بتاتے۔ بیگم بن سنور کر ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں آ رہی ہیں۔ ڈیڑھ گھنٹہ ہوگیا، بیگم دہلیز نہیں پھلانگتیں۔ پھر کیا مجال کہ آپ میر صاحب کے بیان سے اُپرانے یا اُکتانے لگیں۔ انھوں نے یہ وسیع معلومات بڑی محنت سے حاصل کی تھیں۔ ہر علم کا انھوں نے باقاعدہ مطالعہ کیا تھا۔ استادوں سے باقاعدہ سیکھا تھا اور تو اور جب دلّی میں طبیّہ کالج کھلا تو میر صاحب نے ساٹھ سال کی عمر میں اس میں داخلہ لیا اور لڑکوں کے ساتھ بیٹھ کر پڑھنے

لگے اور وہاں سے فارغ التحصیل ہونے کی سند بھی حاصل کی۔

میر صاحب کی داستان جہاں ہوتی وہاں اُجلی چاندنیوں کے فرش بچھ جاتے ۔ میر صاحب کے لیے ایک چھوٹا سا تخت بچھا دیا جاتا۔اس پر قالین اور گاؤ تکیہ ہوتا۔سامعین گاؤ تکیوں سے لگ کر بیٹھ جاتے۔ پان اور حقے کا دور چلتا رہتا۔گرمیوں میں شربت اور جاڑوں میں چائے سے تواضع کی جاتی۔میر صاحب تخت پر براجمان ہوتے۔کٹورے یا گلاس میں پانی منگواتے ۔ جیب میں سے چاندی کی ڈبیا اور چاندی کی چھوٹی سی پیالی نکالتے۔ڈبیا میں سے افیون کی گولی نکالتے۔اسے روئی میں لپیٹتے۔پیالی میں تھوڑا سا پانی ڈال کر اَنٹے کو اس میں گھولتے رہتے اور دوستوں سے باتیں کرتے رہتے۔جب ساری افیون گھُل کر پانی میں آجاتی تو روئی اُگال دان میں پھینک دیتے اور گھولوے کی چُسکی لگا لیتے۔اس کے بعد چائے کا ایک گھونٹ پیتے۔فرماتے ''چائے کی خوبی یہ ہے کہ لب بند،لب ریز اور لب سوز ہو۔'' پھر داستان شروع کر دیتے۔

دلّی میں کہیں داستان کہنے جاتے تو دو روپے لیا کرتے۔پھر ایک دور ایسا آیا کہ لوگوں کو دو روپے بھی اکھرنے لگے تو میر صاحب نے اپنے گھر پر داستان کہنی شروع کر دی اور ایک آنہ ٹکٹ لگا دیا۔دس بیس شائقین آجاتے اور میر صاحب کو روپیہ سوا روپیہ مل جاتا۔بعض دفعہ سامعین کی حسبِ فرمائش کسی ایک پہلو کو بیان کرتے۔کوئی کہتا میر صاحب،آج تو لڑائی کا بیان ہو جائے اور میر صاحب رزم کو اس تفصیل کے ساتھ پیش کرتے کہ آنکھوں کے سامنے میدانِ جنگ کا نقشہ آجاتا۔کوئی کہتا،میر صاحب آج تو عیّاریاں بیان ہو جائیں اور میر صاحب عیّاروں کے کارنامے بیان کرنے لگتے۔میر محمود علی صاحب نے بتایا کہ کلکتہ میں ایک دفعہ لکھنؤ کے ایک داستان گو کی دھوم مچی۔ایک دن ہم بھی سُننے گئے تو دیکھا کہ داستان گو کے آگے کتاب کھلی دھری ہے۔اس میں سے پڑھتے جاتے ہیں اور بہت جوش میں آتے ہیں تو ایک ہاتھ اُونچا کر لیتے ہیں۔طبیعت بڑی مکدّر ہوئی۔جی چاہا کہ کسی طرح میر باقر علی یہاں آجاتے تو کلکتے

والوں کو معلوم ہوتا کہ داستان گوئی کسے کہتے ہیں۔ نہ سان نہ گمان، اگلے دن کیا دیکھتے ہیں کہ کولوٗ ٹولہ میں میر صاحب سامنے سے چلے آتے ہیں۔معلوم ہوا اپنے کسی کام سے آئے ہیں۔قصّہ مختصر، میر صاحب کی داستان ہوئی اور لکھنوی داستان گو ہاتھ جوڑ جوڑ کر کہتا تھا :

''حضور یہ اعجاز ہے۔حضور یہ آپ ہی کا حصّہ ہے۔''

جب داستان سُننے والوں کا قحط ہوگیا تو میر صاحب نے چند کتابیں لکھیں۔مثلاً گاندھی جی کی کھادی تحریک کے زمانے میں ایک کتابچہ'' گاڑے خاں نے ململ جان کو طلاق دے دی'' ''پاجی پڑوس''، ''مولا بخش ہاتھی'' اور ایسی ہی چھوٹی چھوٹی کتابیں کئی لکھی تھیں۔جو ایک بار چھپنے کے بعد پھر نہیں چھپیں۔اکثر رسالوں میں ان کے مضامین بھی شائع ہوئے۔مگر جو لُطف ان کی تقریر میں تھا، تحریر میں نہ آسکا۔

میر باقر علی اپنے نانا میر پیڑا کے شاگرد تھے۔جن بزرگوں نے میر پیڑا کی داستانیں سنی تھیں، کہتے تھے کہ باقر علی کی داستان ان کی پاسنگ بھی نہیں تھی۔غالباً فرق یہی ہوگا کہ وہ بارہ سال تک پردہ پڑا رہنے دیتے ہوں گے، میر باقر علی سال دو سال میں پردہ اُٹھا دیتے تھے۔

بڑھاپے میں ناقدری اور کس مُپرسی کے ہاتھوں میر صاحب کو بڑی تکلیف پہنچی۔دلّی کا کامل الفن آخری داستان گو اپنا پیٹ پالنے کے لیے چھالیا بیچتا تھا۔

اے کمال افسوس ہے، تجھ پر کمال افسوس ہے

(شاہد احمد دہلوی)

مشق

لفظ و معنی

داستان گو : داستان سنانے والا

افلاس : غریبی، مفلسی

پرسش ختم ہوگئی : مانگ ختم ہوگئی

حائل ہونا : رُکاوٹ پیدا کرنا

رزم : معرکہ، جنگ

زیروبم : نیچا اور اُونچا سُر، اُتار چڑھاؤ

عیّار : مکّار، فریبی، شعبدہ باز

منجنیق : ایک آلہ جس سے جنگ کے دوران دشمنوں پر بڑے بڑے پتھر پھینکے جاتے تھے

زمین آسمان کے قلابے ملانا : مبالغہ کرنا

فارغ التحصیل : جو علم حاصل کر چکا ہو، تعلیم سے فارغ ہونے والا

سامعین : سننے والے، سامع کی جمع

تواضع : خاطر داری، دعوت، عاجزی، انکسار

اَنٹے : افیون کی بڑی گولی

لَب بند : شیرینی سے ہونٹوں کا چپکانے والا

لب سوز : ہونٹوں کو جلا دینے والا

لبریز : لبالب، بھرا ہوا

مکدّر : غمگین، ناراض، ناخوش

اکھرنا : ناگوار گزرنا، بُرا لگنا، کھلنا

اعجاز : معجزہ کرشمہ

پاسنگ : معمولی چیز، کم حیثیت ترازو کے پلڑوں کو برابر کرنے کے لیے جو فالتو چیز رکھی جائے

© NCERT not to be republished

کس مپرسی : وہ حالت جس میں کوئی پوچھنے والا نہ ہو، بے بسی

کامِلُ الفَن : فن کا ماہر

غور کرنے کی بات

- شاہد احمد دہلوی نے اس خاکے میں میر باقر علی داستان گو سے متعلق اپنے ذاتی تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ وہ دِلّی کی زبان اور محاورے پر غیر معمولی قدرت رکھتے تھے۔ دلّی میں مروج عام بول چال کے لفظوں مثلاً اُپرانے، اکتانے، اکھرنے اور پاسنگ وغیرہ کا استعمال انھوں نے عمدگی سے کیا ہے۔

سوالات

1. مصنّف نے میر باقر علی کا جو حلیہ بیان کیا ہے اُسے اپنے لفظوں میں لکھیے۔
2. میر باقر علی داستان کس طرح سنایا کرتے تھے؟
3. میر باقر علی کی داستان سننے کے لیے کیا کیا اہتمام کیا جاتا تھا؟
4. میر باقر علی نے اپنے گھر پر داستانیں کہنی کیوں شروع کیں؟
5. میر باقر علی نے کون کون سی کتابیں لکھیں؟
6. چائے کی خوبی یہ ہے کہ وہ لب بند، لب ریز اور لب سوز ہو، ان الفاظ کی وضاحت کیجیے۔

عملی کام

- اپنے کسی قریبی دوست کا خاکہ لکھیے۔

© NCERT not to be republished